PROF. AHMAD RAFIQ AKHTAR'S LECTURES
WWW.ALAMAAT.COM

# اسلامی تاریخ میں سفرنامہ

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا ○
(الاسراء آیت ۸۰)

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون○ وسلم علی المرسلین○ والحمد للہ رب العلمین ○
(الصافات آیت ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲)

خواتین وحضرات! میں نے بہت بچپن میں شاعری شروع کی تھی اور اگر جاری رکھتا تو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سب سے Young صاحب دیوان شاعر ہوتا۔ مگر شاعری میں نے بلوغت کے وقت دو وجوہات سے چھوڑ دی۔ ایک تو مجھ میں یہ احساس ہوا کہ خدا کے سوا میں کسی اور کی تعریف کر ہی نہیں سکتا اور دوسرا مجھے اس وجہ سے شاعری چھوڑنا پڑی کہ میں دوسروں سے اپنی داد کی توقع رکھنے پر مجبور ہوتا تھا اور یہ دونوں وجوہات میرے نزدیک بہت بڑا نقص بن جاتی تھیں۔ اس شخص کے لیے جس نے اندرون ذات کے سفر میں بہت سارے شجر ہائے سایہ دار کو ترک کر کے آگے بڑھنا تھا۔ بودلر نے ایک جملے میں کہا تھا کہ

Writer's every word is an act of generosity

چاہے وہ اچھا لکھے یا برا لکھے۔ ادیب کا ہر لفظ فیاضی ہے۔ صوفی اور ادیب میں بہت تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ صرف ایک لفظ کا۔ Mystic's every act is an act of generosity اگر اس کا ہر لفظ Act of generosity ہے۔ تو Mystic کا ہر ایکٹ Act of generosity ہے۔ قلوب میں اور انسان کی فراستِ عقل میں اگر آپ کو شروع سے کوئی ادب پروان چڑھتا نظر آتا ہے تو وہ سفرنامہ ہے۔ تلاش حق میں نکلے ہوئے وہ سفرنامے جو فاہیان وہیون سانگ نے مرتب کیے، وہ ادیب نہ تھے مگر ان کو سفر کی تلاش نے، ان کو ان کے مظہر کی تلاش نے انہیں بدھ مت کا سراغ ڈھونڈنے، اس کی تعلیمات کا سراغ حاصل کرنے کے لیے۔ وہ دور دراز سے نکلے اور ان کے سفرنامے کے ذریعے ہمیں اس وقت کی تہذیبات کے انتہائی ماخذ نصیب ہوتے ہیں۔

مجھے آج تک Cicero کا یہ لطیف، لذیذ اور مزیدار واقعہ سننے کو نہ ملتا، اگر ایک مسافر سفرنامے میں، اس کا ذکر نہ کرتا۔ تو پلوٹارک کہتا ہے کہ میں سسرو کو ملنے جب اس کے گھر گیا اور دور دراز سے سفر کرتا ہوا اس وقت کے امام علم وعقل و

فلاسفی کو ملنے گیا تو اس کا دروازہ بند تھا اور میں نے Knock کیا تو اندر عجیب وغریب شور مچ رہا تھا۔ خوفناک چیخیں اور کربناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد میری دستک پر دروازہ کھلا میں نے دیکھا کہ عجیب سا منظر ہے کہ Cicero زمین پر گھوڑی کی طرح جھکا ہوا ہے اور دو چار بچے اس پر سوار ہیں، کوئی اس کے بال کھینچ رہا ہے، کوئی اس کے کپڑے نوچ رہا ہے، کوئی اسے جوتا مار رہا ہے۔ تو میں حیرت زدہ ساکت کھڑا رہا۔ میں تو اس دہر کے نادرۂ روزگار فقیہہ وعالم کے پاس آیا تھا۔ یہاں اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ سرو نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا:

Hush, Dont tell it to anybody, till you have your children.

ایک اہم سفر نامے کی بدولت ہی کسی مقام اور جگہ سے ایک ایسا Insight Develope کرتے ہیں جو ہمیں زندگی بھر کے لیے ایسا درس، سبق یا عزم دے جاتا ہے جس کا حصول کہیں بھی ممکن نہیں ہوتا۔ مسافر اور مقامی کی یہ جنگ ادیب میں ہر وقت جاری رہتی ہے۔ وہ جو مقامی ادیب ہے وہ کوچہ محبوب چھوڑنا ہی نہیں چاہتا، اس کی زندگی کا تمام محور، وہی چہرہ، وہی رخ، وہی انداز، وہی قلب ورخسار ہیں اور وہ یہ کہنے پہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

اور دوسری طرف وہ مسافر ہے جو یہ Claim لے کر نکلتا ہے کہ میں اپنے کسی جذبے کی تغلیط نہیں کروں گا۔ میں اپنی تمام انسانی رغبتوں کو کسی مقام پر ٹھہراؤ کا رتبہ نہیں دوں گا۔ مجھے Out Growth عزیز ہے، میں نے بہتیرا آگے بڑھنا ہے، میں اپنے ہر جذبے کو آگے بڑھاؤں گا۔ اس کے نزدیک

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

یہ دونوں Attitude اتنے مختلف ہیں مگر پورے Attitude سے ادب مرتب ہوتا ہے۔ ادھر سفر ناموں سے ادب مرتب ہوتا ہے، اور ادھر مکان سے ادب مرتب ہوتا ہے۔ دونوں میں کون بہتر وبرتر ہے۔ اس کا تو شاید فیصلہ نہ ہو سکے مگر ایک خامی رہ جاتی ہے۔ ایک خامی اُدھر رہ جاتی ہے اور ایک خامی اِدھر رہ جاتی ہے۔ مقامی ادیب چیزوں کو مکمل Concentration سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کے Visual Aspects کا Locale محدود ہوتا ہے اور وہ بڑے غور وخوض سے جب اس پر رائے دے رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو Out Grow نہیں کر رہا ہوتا۔ بہت کم شاعر ایسے ہیں جو اپنے آپ کو Outgrowt کر کے شاعری کرتے ہیں اور ایسے تمام شاعر بڑے شاعر ہوتے ہیں۔ چاہے وہ اقبال ہو، یا غالب ہو۔ جس شاعر نے جس مقام پر اپنے آپ کو Outgrowt کیا اور جس بلوغت فکر کے ساتھ اپنے ذاتی رنج وغم کو کائناتی رنج وغم بنا لیا وہاں وہ عظمت شعر سے آشنا ہو جاتا ہے۔ ہر شاعر کا بھی ایک تصوف ہے۔ میں اسے ایک بدترین اور بدکار شاعر کہوں گا جو پوری زندگی میں کم از کم چند اچھے شعر بھی تخلیق نہ کر سکے۔ کوئی بھی شاعر پچیس برس کے بعد تو کوئی اچھا شعر لکھ ہی لیتا ہے۔ اگر ایک شخص مسلسل ادب کے ساتھ جور وستم وبلا پہ آمادہ ہی ہے تو یقین یہ ہے کہ تیس سال کی مشقت تا

مہ کے بعد دو چار اچھے شعر ضرور لکھ لے گا۔ ہر چیز کی ایک Maturity ہے Language بذات خود ایک Maturity ہے اور بسا اوقات زبان کے اشعار جو ہیں، وہ خیال کے اشعار کو مات دے دیتے ہیں اور حضرت داغ غلط دعویٰ نہیں کرتے کہ ہماری زبان، ہمارا انداز گفتگو بعض اوقات بڑے بڑے خیال کے شاعروں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور باوجود اچھا خیال ہونے کے ضروری نہیں کہ اقبال کی زبان اہل زبان کو پسند آئے۔ دوسری قسم کے مسافر کے یہ تمام تجربات، ایک قسم کا Attitude ہوتا ہے۔ تمام سفرنامے ایک خواہش کو ساتھ پھرتے ہیں۔ وہ چونکہ کسی بھی Locale پہ اپنے آپ کو قائم نہیں کرتے استفادہ نہیں کرتے ایک Flamboyant سی Look ہوتی ہے۔ ایک جلدی کی نظر ہے اور جلدی کی نظر میں ان کے بعض فیصلے، بعض Ideas، بہت ناقص ہوتے ہیں۔ کہیں مسافر Defensive Mechanism ساتھ لے کر جاتا ہے۔ کہیں کہیں Aggressive Tones ساتھ لے کر جاتا ہے، کہیں کہیں اپنا احساس کمتری اس کے ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں کہیں وہ دوسری تہذیب سے ناشناسائی کا جذبہ پہلے سے پال کر لے جاتا ہے۔ یہ سارے کے سارے انداز اور تیور سفرنامے کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اگر آپ ابن بطوطہ کو دیکھیں تو اس انداز کے سفرناموں سے ایک بیش قیمت چیز پراسراریت ملتی ہے۔ اسرار کی خواہش سفرنامے کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے اور یہ جاننے کی خواہش کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔؟ کیسے وہ رہتے ہیں؟ کیا انداز فکر ہے؟ کیا ہماری طرح ہی وہ کامن لوگ ہیں؟ وہاں بھی کچھ Un-common attitude ہوتے ہیں۔ ہم ایک واقعہ پڑھتے ہیں کہ شارلیمان Charlemagne کے دربار میں ہارون رشید کا ایک تحفہ گھڑیال پہنچا۔ اس گھڑیال کا تذکرہ مدتوں ہم یورپی لٹریچر میں پڑھتے ہیں۔ وہ عجیب وغریب کلاک تھا کہ اس کلاک میں عین ایک گھنٹے کے بعد جو بھی وقت ہو چکا ہوتا، اس کے مطابق اس گھڑیال میں سے اتنے ہی گھوڑے دوڑتے ہوئے باہر نکلتے، ہنہناتے، اعلان کرتے اور واپس آجاتے۔ ہمیں یہ ایک مسافر نے بتایا کہ جب شارلیمان کے دربار میں یہ تحفہ پیش کیا گیا تو اس کے تمام درباری اٹھ کر بھاگ نکلے۔ بڑی مشکل سے ان کو اکٹھا کیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ معاملہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے بادشاہ نے ہمیں یہ تحفہ بھیجا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے بادشاہ نے ہمیں مغلوب کرنے کے لیے جادو کیا ہے۔ ایک اسی قسم کا واقعہ ایک مسافر نے ہمیں الحمرا کی داستان میں سنایا کہ الحمرا میں سلطان وقت نے اس محل میں تالاب بنایا تھا جس کے اردگرد تمام آئینے لگے ہوئے تھے اور وہ تالاب پارے سے بھرا ہوا تھا۔ جب کسی Mechanism سے تالاب کے پارے کو حرکت دیتے تو ایسے لگتا کہ سارے کا سارا محل گرنے کو ہے۔ اس کا عکس ایسے منعکس ہوتا کہ اس کی بلند وبالا دیواریں گرتی ہوئی نظر آتیں۔ اسی زمانے میں Spanish ریاستوں کے حکمران اور تمام یورپی بادشاہوں کا ایک وفد عین اسی وقت سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ اموی بادشاہ سلطان عبدالرحمٰن ثانی تھے۔ اس کے دربار میں جب وفد آیا اور تھوڑا سا پارے کو ہلایا گیا تو چیختے چلاتے ہوئے تمام یورپی سفیر اور وفد کے امراء بھاگ نکلے کیونکہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ شائد محل گرنے کو ہے۔ اب وہ سفرنامے جو یورپ کے بارے میں لکھے جاتے ہیں مجھے بڑے Nostalgic لگتے ہیں۔ بڑے اداس سے لگتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ہم نہ چاہنے کے باوجود ان سے بہت مرعوب ہیں۔ مرعوب نہ ہونے کے عزم کے باوجود ہم ان سے بہت مرعوب ہیں۔ اسی ذہنی مرعوبیت کے سبب ہمیں ان کا وطن دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سرسید احمد خان سے جو مرعوبیت شروع ہوئی وہ قرآن کی تفاسیر میں بھی داخل ہوگئی۔ جب

انہوں نے سٹیم انجن وہاں دیکھا تو سورۃ دخان کو اسی پر منطبق کر دیا۔ اسی طرح وہ ہمارے بڑے اسکالرز جو کچھ عرصے کے لیے یورپی تعلیم سے آشنا ہوئے وہ اپنی Outgrowth نہیں کر سکے۔ ایک بدقسمتی ہوئی کہ جب یورپی تعلیم یا اس وقت کے بعد ہماری اکیڈمک پراگندہ ہوئی اور ہمارے مکاتب فرسودہ ہوئے اور ہمارے قصے کہانیاں ضائع ہوئیں۔ یاد رکھیے کہ داستان ازل سے صرف دو جگہوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ تمام مسافرت کی کہانیاں صحراؤں میں، الاؤ کے گرد بیٹھنے والے مسافروں، ترکمانوں یا ان شہسواروں نے تخلیق کیں جو سارے دن کی مسافرت کے بعد صحرا میں الاؤ کے گرد بیٹھ کر صرف داستان سننے کے شائق ہوتے تھے۔ اور ایسی چیزیں سنتے کہ جو انہیں رات کو اچھی نیند سلا دیں۔ یا سمندروں کے ساحلوں پر بندرگاہوں میں جہاں دور دراز کے مسافر اترتے ہوں گے، مقامی لوگوں کو حیرت انگیز قصے سنایا کرتے ہوں گے مگر ان مسافروں میں دیار غیر میں یہ تاثر لے کر نہیں جاتا ہے۔ اور وہ Comparative classical matches ڈال رہا ہوتا ہے اور اس کے خیال میں ایک تہذیب دوسری تہذیب سے لڑ رہی ہوتی ہے۔ ہم اپنی نسل، اپنے Clash of patriotic اور Clash of civilization ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تہذیبات کی کروٹیں ایسے بدلیں کہ وہ زمانہ جس میں ایک کریڈٹ آپ مسلمان تہذیب کو ضرور دیں گے جو بڑی سربلند رہی، بالغ رہی بلکہ جب قرطبہ میں اسی ہزار حمام تھے، شانزے لیزے میں، گھٹنوں تک خواتین پائینچے اٹھا لیا کرتی تھیں کہ کیچڑ بہت ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ برنارڈ شا کے ڈرامہ Pigmalion میں لندن میں جو شناخت نظر آتی کہ کیچڑ میں سے گزرتے ہوئے خاتون کے پائینچے اٹھانے کو بدتہذیب کہا جاتا تھا۔ پائینچے چاہیں خراب ہو جائیں گھٹنوں کی نمائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ وہ مسافرتیں ہیں جو اندر کے انسانی شعور میں جاری رہتی ہیں تو فرق یہ ہے کہ علم بھی مسافرت میں ہوتا ہے۔ علم بھی سفر کرتا ہے اور سب سے بڑے تاثرات علمی طور پر ہی معاشروں میں منعکس ہوتے ہیں۔ ایک آدمی جو بغیر علم جا رہا ہوتا ہے، وہ تو مزدور ہے، کسب کرنے والا ہے، اس کو تو زندگی گزارنے کے سوا چند دن آٹا رزندگی بڑھانے کے سوا کسی دوسرے معاشرے سے کوئی غرض نہیں ہوتی مگر دراصل وہ لوگ جو اس تجسس کے ساتھ جاتے ہیں، کہ اگر ہم پست ہیں اور کوئی بالا ہے تو اس کے بالا ہونے کا راز کیا ہے؟ بعض اوقات سراغ رسانی ہی اس حد تک پہنچتی ہے کہ ایک مسافر علم علامہ ابوریحان البیرونی جب ہندوستان پہنچتا ہے تو پورے بارہ سال ہندو بن کر، ان کے کلچر میں، ان کے مندر میں وقت گزارتا ہے کہ ان کے کلچر اور مزاج کو اچھی طرح سمجھ لے۔ مستند تاریخ اور تاریخ اخبار الہند مرتب کرتا ہے اور یہ مسافرت کا خاصہ اس ادیب کا خاصہ ہے جو مسافرت میں جاتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ایک ایسی صنف چھوڑ جائے کہ اہل ادب کے لیے ایک Curiosity پیدا کرے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اچھا سفرنامہ اس کو سمجھونگا کہ میں نے ایک مسافر کے انداز پڑھے اور سمجھے اور اس کے طریقہ کار کو دیکھا۔ جب کبھی خدا نے مجھے وہاں جانے کا موقع دیا تو میں اس بات کا قائل ہوا کہ اس نے جھوٹ نہ بولا تھا۔ ادبیت کیا چیز ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لکھتے کیوں نہیں؟ میں نے کہا کہ لکھنے کی عمر کیا ہے؟ ادب کی زندگی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ رہتی دنیا تک ہے۔ ایک بڑا عجیب سا حیرت انگیز اور تاریخی پس منظر یاد آیا کہ جو بھی کائناتیں پہلے تباہ ہوئیں، جو تہذیبات تباہ ہوئیں، چاہے وہ موہنجوداڑو یا ہڑپہ کی تھیں، ان کا کوئی سراغ اب باقی نہیں۔ ہم اس معاشرے کے کسی بڑے شاعر کا نام نہیں جانتے۔ ہم جس چیز کو ادبی اور دائمی سمجھتے ہیں، وہ ادب ہو یا شاعری، یا وہ انسان کے خصائص

میں سے ایک خصوصیت ہے۔ انسان کے اوصاف میں سے ایک وصف ہے، اس کے ذہنی ارتقاء کی ایک سیڑھی ہے۔ اعلیٰ ترین Values کے حامل ہونے کے باوجود Mystic کیوں نہیں ہو جاتے؟ عجیب بات ہے کہ ایک بڑا ادیب جو دنیا میں بہترین Aesthetic knowledge دے رہا ہوتا ہے جیسے آسکر وائلڈ ہے کہ

Tread lightly here, she lies under the snow,

Speak gently, she can hear the daisy grow,

جو اتنی خوبصورت Learning دیتا ہے، بدقسمتی دیکھیے کہ Homosexuality کے چارج میں جیل کے اندر جاتا ہے۔ موت پاتا ہے۔ یہ کیا عجیب بات ہے؟ کیا ادب کو ہم زندگی کا ایک ایسا پہلو سمجھیں یا ایک ایسا انفرادی پہلو سمجھیں جو کسی قسم کے اخلاقی ضوابط سے یا کسی قسم کی اخلاقی اعلیٰ Committment سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ کیا ادیب ایک ایسا Narcissist ہے جو انسان کے توازن کو بگاڑنا چاہتا ہے یا عظیم شاعر ایک Fore Runner ہے۔ اس تمام Pornographic Movies کا، ان تمام Pornographic Literature کا جو پہلے لٹریچر کے لیے Values، اپنے لوگوں کو دینا چاہتا تھا۔ عرب کے لوگ آپ کو پتا ہے کہ تشبیب میں کتنے ماہر تھے؟

تو سلطان سلمان عبدالملک کے زمانے میں ایک شاعر نے تشبیب پڑھی تو خلیفہ نے کہا کہ تجھ پہ تو حد لگ گئی ہے۔ کیونکہ تو نے زنا کا اقرار کیا ہے۔ تجھ پر تو حد لگ گئی ہے۔ وہ بہت گھبرایا کہ کیا ہوا ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ تو نے مجھے جو واقعہ بتایا ہے، اس کے بعد تُو حد سے نہیں بچ سکتا۔ اس نے کہا! اے خلیفہ میں جھوٹا ہوں۔ خلیفہ نے کہا یہ کیسے ہے۔ تو نے تو اقرار کیا ہے اور اقرار کے بعد تو کیسے جھوٹا ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ سرکار مجھ پر قرآن کریم گواہ ہے کہ شعراء تو جھوٹ کی وادیوں میں سفر کرنے والے لوگ ہیں تو بادشاہ نے کہا کہ آج تو بچ گیا۔

میں یہاں ذاتی گناہ گننے نہیں آیا بلکہ ادب اور تصوف کے مابین اس خلیج کی ضرور نشاندہی کروں گا جس کی وجہ سے ادیب بیک وقت ادیب اور صوفی ہو جاتا ہے اور ایسا اصولاً ضرور ہونا چاہیے کہ پھر ادیب کو بھی اپنے کسی نہ کسی تصور کی Outgrowth کرنی چاہیے۔ اگر اس کے پاس تحریر و تقریر کا ملکہ ہے، اگر اس کے پاس اندازِ گفتگو ہے، اگر القابات کہنے کا سلیقہ ہے تو پھر اسے اپنا موضوع اور اپنی Committment کسی نہ کسی اصول کے ساتھ واضح کرنا پڑتی ہے ورنہ وہ ادیب بنیادی طور پر انارکسٹ ہوگا۔ ایک کمیونسٹ مصنف کارل مارکس (یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اس کے نقص کی تعریف کرلیں یا اس کو داد دیں) کا کمال یہ ہے کہ دنیا بھر کی تمام تاریخ اپنے فلسفے کی رو سے پڑھ رہا ہے۔ وہ وہی غلام اور آقا کے فلسفے کو لے کر آگے چل رہا ہے۔ حتیٰ کے ادب پر بھی اس نے Bolshevik اور Proletariat کی حدود لگا رکھی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام چیزیں کسی Special نقطۂ نظر اور Committment سے دنیا کا Angle واضح نظر آتا ہے۔ اگر آپ کی Committment ہی نہیں ہے اور آپ کے خیال میں کسی ادب کا کوئی انجام ہی نہیں ہے۔ حیرت کی بات یہ دیکھیے کہ دنیا کی باقیات قدیم میں آپ کو جو سب سے پہلا ادبی مخطوطہ نظر آتا ہے یا جو تحریر نظر آتی ہے، وہ تصوف میں ہے۔ وہ اس سفر پر ہے جو Outgrowth کا سفر ہے۔ وہ میسوپوٹیمیا کے Gilgamish کی داستان ہے اور اگر کچھ تحریروں میں ان آثار قدیمہ سے کچھ بچتا ہے اور ان تہذیبات میں سے جو اللہ نے تباہ کیں، ان میں سے اگر کچھ بچتا ہے تو ایک واضح ترین

داستان جو بچتی ہے وہ Ecedo اور گلگامش کی داستان ہے اور وہ داستان ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ مگر اس داستان کی مقصدیت صرف ایک ایسے متجسس بادشاہ کا سفر ہے۔ جو بالآخر اسے خدا کی طرف لے جاتا ہے جو اپنے جسم کے فاصلوں کو طے کرتا ہوا، اپنی روح کے حقائق کو طلب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ علم ہمیشہ مسافر کی طرح حاصل ہوتا ہے۔ فاہیان اور ہیون سانگ تلاش علم میں چلتے ہوئے دنیا اور علم کی منظر کشی کرتے ہیں اسی طرح ابن بطوطہ کے سفر ناموں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ جھوٹ بہت بول جاتا ہے۔ اس کے تاریخی حقائق کی تصدیق بہت مشکل ہے اور اس کے ہر سفر میں مبالغے کا ایک عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔ چاہے یہ مبالغہ حقائق یا کسی Defensive Mechanism پر مبنی ہو۔ جیسے عطاء الحق قاسمی کے تمام سفر ناموں میں Aggressive Romanticism چیختا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں وہ حالات پر نظر ڈالتے ہوئے ایک Aggressive Romanticism جو اس کے اندر ہے مستنصر حسین تارڑ اپنی Individual حیثیت کو Maintain کرنا چاہتا ہے۔ صرف شرق و غرب میں نہیں۔ مگر آپ قرآۃ العین حیدر میں دیکھیں تو اس کی زندگی کا تمام ناول ہی سفر نامہ ہے اور وہ Out most board سے اس تہذیب کے Nostalgia سے کبھی آزاد ہی نہیں ہو سکی۔ وہ صدیوں کے سفر کو کبھی بھلا ہی نہیں سکی اور اس کی اول تحریر سے آخری تحریر تک اسکے Nostalgic سفر کی نمائندگی ہمیں صاف نظر آتی ہے۔

میں آپ کو سچی بات بتاؤں کہ میں نے رانجھا صاحب کے سفر نامے کی ایک ہی کتاب دیکھی۔ زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کتاب میں مجھے رانجھا ایک ایسے مسافر کی طرح نظر آیا، میں یہاں اس لیے بالکل نہیں آیا کہ

من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو

بلکہ میں اس لیے آیا ہوں کہ اگر میں پہلی صورتحال جو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر شروع کی تھی

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا۔ (الاسراء آیت ۸۰)

کہ مجھے سچ میں داخل کر کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دو چیزیں اس میں نظر آتی ہیں کہ سفر نامہ Individually اور Originally نہیں لکھا گیا۔ سفر نامہ میں یہ عجیب و غریب رخ اس چیز کا ہے کہ پہلے سے اگر آپ ایک تعداد دیکھتے ہیں ان کتابوں کی، جو حاجیوں کے حج کے بعد سفر نامے شروع ہوئے اور جس میں بہت سارے سفر ناموں میں بڑی تازہ دلی پائی اور ان میں سے آپ دیکھیں گے کہ جو حاجی جا رہا ہے حج کو، وہ ایک سفر نامہ مرتب کر رہا ہے مگر عبدالحمید عدم نے بھی ایک سفر نامہ مرتب کیا ہے فرمایا کس قدر بوجھ بڑھ گیا گناہوں کا حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا جو مسافر وہاں دیار حرم کو جا رہا ہے، وہ حرم کے نام سے ایک سفر نامہ ضرور تحریر کرتا ہے۔ جو یورپ کو جا رہا ہے، وہ یورپی اچھوں کی تفاسیر اپنی کتاب حقائق میں ضرور لکھتا ہے، جو روس کو جا رہا ہے صاف نظر آتا ہے کہ مخاصمت ذہن کے ساتھ جا رہا ہے، کہ میں نے اس انداز فکر کی تقلید نہیں کرنی اور اگر آدمی Pre-set Ideas کے ساتھ کسی تہذیب کے سفر کو جائے گا تو یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔ جب میں امریکہ گیا تو آپ کو حیرت کی بات بتاؤں کہ میں نے سفر نامہ نہیں لکھا مجھے کریشن وہاں نظر نہیں آئی تو میں بڑا پریشان ہوا کہ میں کیا چیز واپس لے کر جاؤں گا اور کیسے ان پر تنقید کروں گا لائنوں میں کھڑا ہوا، احمقوں کی طرح آسمان

دیکھنا اور اپنی باری کا انتظار کرنا۔ لہٰذا مجھے تلاش رہی کہ میں سفر کے نقاط ڈھونڈوں کہ کل جاؤں تو میرا تو کوئی Defence نہیں ہے۔ یہ کم بخت تو بازی لے گئے ہیں، صفائی ستھرائی میں، انارچڑھاؤ میں، دیکھنے میں، Maintenance of orders میں، Attitudes میں۔ حقیقت میں یہ بازی لے گئے ہیں۔ بالآخر مجھے ایک چیز مل گئی، میں ایک Washroom میں گیا تو اوپر لکھا ہوا تھا کہ

Not washing hands is illegal.

بڑا خوش ہوا۔ یہ وہ بد بخت قوم ہے جنہوں نے اپنے Washroom کے اوپر لگایا ہوا ہے کہ

Not washing hands is illegal.

وجہ یہ ہے کہ اگر لوگ Washroom کے بعد ہاتھ دھوتے تو یہ کبھی نہ لکھا ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے غلیظ ہیں اور ہم تو پیدائشی باتھ روم سے نکل کر ہاتھ دھوتے ہیں۔ پہلے ماں باپ دھلاتے ہیں پھر خود دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم تو صفائی کے معیار میں یقینی حد تک ان سے بہت آگے ہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ کوئی تہذیب اتنی ایماندار نہیں ہو سکتی یہ میرا اصول تھا۔ Technically I would say کہ جو کچھ آپ کو نظر آتا ہے، ویسے ہی نظر آنا چاہیے۔ میں چونکہ مسافر تھا تو ایک دم سے فلیش لائٹ پڑ رہی تھی تو میں نے کہا ہاتھ رکھ کے دیکھوں کہ فلیش لائٹ کے نیچے کیا جا رہا ہے۔ مجھے فلش لائٹ کے نیچے ایک عجیب سا لطیفہ نظر آیا۔ سڑکوں کے کنارے ننگے امریکی کچھے وچھے ڈالے اور اپنے ہاتھوں میں کچھ اٹھائے آوازیں لگا رہے تھے۔ میں بڑا شرمندہ ہوتا کہ بسوں سے گزرتے ہوئے یہ ریوڑیاں بیچنے والے ہماری اقدار کا بدنما داغ ہیں جن کی ترقی پر سالم دلیل ہیں یہ ذلت صرف ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے۔ میں نے وہاں بے شمار کالے، پیلے، نیلے اور گورے لوگ ٹیلیفون ہاتھ میں اٹھائے نظر آئے۔ یہ ٹیلیفون بڑا سستا ہے۔ جب انہوں نے ٹیلیفون کی پانچ ڈالر قیمت بتائی تو میں پانچ ڈالر پھینکنے پر آمادہ ہوا میرے ساتھ والے نے کہا، یہ جھوٹا ہے۔ یہ چوری کے ہوتے ہیں، میرے ساتھ والا چونکہ مستقل امریکی تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ نہ لینا یہ صرف ایک منٹ چلیں گے اور بجلی لگاؤ گے تو یہ ختم ہو جائیں گے۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ اگر ہمارے اور ان کے اعلیٰ ترین طبقے میں ہم آہنگی موجود نہیں ہے تو پست لیول پہ میری اور اس قوم کے افراد میں ہم آہنگی موجود ہے۔ اور آپ کو پتا ہے کہ حُب علی نہ سہی بغض معاویہ تو مشہور ہے۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ میری نگاہ اس مسافر کی طرح تھی جو کوشش کر رہا تھا مگر ایک بات میں آپ کو بتاؤں

Finally I reached to one conclusion that clash of civilization

مجھے تو ایک بہت بڑی نسل کا انسان ملا اس نے کہا کہ پروفیسر صاحب

I came to seek help from you. I have six daughters and one of my daughter has aloped with someone. Can you help me?

میں نے کہا مدد کیا لینے آئے ہو۔ بولا، کیا وہ واپس آ سکتی ہے؟ میں نے کہا، میں وہ تو واپس نہیں لے کر آ سکتا باقی پانچ بچا سکتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیٹیوں کو کیا دیا؟ تم یہاں جو آسانی کی خاطر آئے تھے تم نے اپنے

بچوں کو کیا دیا؟ تم نے اپنی اولاد کو اتنے اللہ میاں دیے کہ ان کے پاس چناؤ کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ اللہ میاں نے انسان کی آزمائش بھی بتوں سے کی کیونکہ وہ بھی اس کے پیدا کردہ ہیں۔ دورِ حاضر میں دیکھو جہاں اللہ تا بلند و برتر ہے وہاں اس نے اپنا مخالف لات، منات عزیٰ نہیں بلکہ Statue of Liberty کھڑا کیا تھا۔

امریکہ میں جب اس بت پر میری نگاہ پڑی تو بے اختیار مجھے ہنسی آئی کہ اے اللہ تو باز آ ہی نہیں سکتا۔ تجھے ہر صورت میں مخالفت کے لیے ایک بت چاہیے اور اس عصرِ حاضر میں سب سے ترقی یافتہ بت کا نام Statue of Liberty ہے خدا بندشیں پیش کر رہا ہے۔ اور آزادی کا مجسمہ آزادیاں بانٹ رہا ہے۔

اس مقابلے میں Academic Religion کہیں Exist نہیں کر سکتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پورا فلسفہ مذہب اس نہج میں ناکام رہتا ہے۔ علما کو دیکھا۔

All of them were very rigid, dogmatist, and fundamentalist.

اس لیے کہ ان کے پاس Liberty کے Concept کو Match کرنے کے لیے کوئی Instrument ہے اور نہ انداز فکر اور نہ خیال ہے۔ ایک تازہ ترین نوجوان نسل کو Concept of Liberties بہلا سکتی ہیں۔ اسلام کے پاس ان کو دینے کے لیے کیا ہے؟

Capacity of Civilization جہاں آپ کے Dogmas پر ضرب لگاتی ہے جہاں آپ کو رسوا کرتی ہے وہاں ایک General سا سوال پوچھتی ہے۔ برطانیہ میں لوگ جب نئے نئے انڈیا سے آئے تو ان کا انداز فکر و نظر ذرا مختلف تھا۔ وہ اپنے رویوں، افعال اور کردار میں سخت تھے۔ مذہب بنیادی طور پر Flexies میں Dogmas کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت کم مذہب میں ایسا فرد پیدا ہوتا ہے کہ دو سو سال کے لیے مذہب پر اس کی چھاپ رہ جاتی ہے۔ حجۃ الاسلام محمد بن غزالی کا عروج ہوا۔ دو سو سال اسلام غالب تر آ گیا۔ ادھر مواحدین اور مرابطین کی تحریک شروع ہو گئی اس وجہ سے اسپین پر مسلمان ڈیڑھ سو سال مزید غالب آ گئے۔ اس زمانے میں ایک ایسا استاد اور عالم پیدا ہوا جو مدتوں تک قرطبہ اور استنبول پر حکمرانی کرتا رہا اور بعد میں بھی اس کے خیالات اور نظریات آکسفورڈ اور کیمبرج کی ٹیکسٹ بکس میں چمکتے رہے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ڈیکارٹ جملہ بہ جملہ، لفظ بہ لفظ، عین بعین، پورے کا پورا غزالی نقل کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہتا کہ اس نے غزالی کو نقل کیا ہے۔ مسافرت علم کا یہ عالم ہے کہ جب ہم وہاں جاتے ہیں اور مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس مرعوبیت کی کیا وجہ ہے۔ یہ لین دین تو صدیوں تک جاری ہے، کبھی مشرق کبھی مغرب اپنی اقدار کی پستی آپ پر لازم ہونی چاہیے۔

مغرب کا ایک بہت بڑا عالم، دانشور مفکر اور ادیب، اس کے نام کے ساتھ کتنے القابات ہیں۔ ادھر میرے محلے کا مولوی ہے۔ خطیب العصر، لسان الامت، مجاہد عصر حاضر، علامہ قبلہ، مولوی، مولانا بنا پھرتا ہے۔ اگر اس آدمی کو دیکھیں تو شرمندگی علم بڑھ جائے کیونکہ ان کے Titles مغرب کے علماء کے مقابلے میں ان گنت اور زیادہ عالمانہ ہیں۔ کیا آپ نے کبھی مغرب کے علماء کے ناموں کے ساتھ اتنے ثقیل، وزنی اور ڈھیروں ٹائٹل Attached دیکھتے ہیں؟ مگر وہاں کا

تخصص یہ ہے کہ علم وجاہت طلب ہے۔ ان کا اداکار بھی وجاہت طلب ہے۔ ان کا سکالر بھی Recognition مانگتا ہے۔ اسی طرح ہمارا عالم بھی اپنی منفرد شناخت کا حریص ہے۔ لیکن علم اس کی اولین ترجیح نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے علماء فقط علم کی جستجو اور تحقیق کے لیے جیتے اور مرتے تھے۔ ابن سینا آخری دنوں میں بیماری کے دوران میں اپنے شاگرد سے کہنے لگا کہ طاق سے ذرا فارابی اور ارسطو کی شرح اٹھا کر دو۔ اُس نے کہا حضرت خدا خدا کرو جان لبوں پر ہے۔ نزع کا عالم ہے، رخصت ہو رہے ہیں اور آپ ابھی ارسطو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا اے کم بخت کیا تم حدیث نہیں سنی ہے کہ تلاش علم میں چلتا ہوا ہر طالب علم شہید ہے اور وہ خدا کے نزدیک اتنے بڑے رتبے کا مالک ہے کہ اس کو بڑے سے بڑے عابدوں اور محدثین سے بالا اٹھایا جائے گا۔ میں تیری طرح کلمہ پڑھوں، میں اللہ کے علوم اس طرح جانوں کہ میں آخری لمحوں میں بھی تلاش علم کر رہا ہوں۔ یہ وہ مسافرت ہے جو ہمارے پہلے لوگوں کے پاس تھی۔ اب ہم اس سے عاری ہو گئے ہیں۔ اصل میں عالم اور فاضل لوگ ہی زندگی اور معاشرے کا حسن ہوتے ہیں۔ یہ کونسا سفر علم ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اب خدا گواہ ہے کہ میں نے اس معاشرے میں کوئی Intellectual نہیں پایا بقول اقبال

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

اس شعر میں علامہ اقبال زندگی اور علم کے سفر نامے میں فکری غربت کے ایک سنگ میل کا پتا دے رہے ہیں اور چلتے چلتے اس کرب کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس زمانے میں ایک بھی غیر معمولی حیثیت کا حامل کوئی صوفی دانشور نہیں ہے جو اس زمانے کے کھیت میں جدید اور تازہ خیالات ونظریات کے بیج بو سکے۔

کوئی Intellectual نیا خیال دے گا تو میں سمجھوں اور مانوں گا۔ اگر یورپ سے Existantialism بھولے بسرے سے بھٹکتی ہوئی ادھر آ گئی ہے تو پورا عصر ہی وجودیت کا ہو گیا ہے اگر ایک Existentialist ہے تو دوسرا Determinist ہے۔ اور اس کے پاس جو خیال آ گیا وہ ایک صحیفہ مقدس کی طرح ادباء پر اترا، دیکھتے دیکھتے پورا معاشرہ Determinist ہو گیا۔ اگر وہاں تھوڑی سی کلیت فکر آئی اور ادیب نے ذرا Naked الفاظ میں حقائق بیان کر دیے تو ہمارے ادیبوں نے قسم کھائی کہ ہم پیچھے نہیں رہیں گے۔ Where lies the committment? میں خود کیا ہوں؟ میرا معاشرہ کیا ہے؟ میرا ادب کیا ہے؟ میرے ادب سے تو مرے وجود کی شناخت نہیں ہوتی۔ میرے ادب سے میرے معاشرے کی شناخت نہیں ہوتی۔ اسلام سب سے بڑا مہاجر ہے، سب سے بڑا مسافر ہے۔ کہاں سے چلتا ہوا دیار غیر میں آ کر رکا ہوا ہے۔ عتبہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علم آخر میں بھی مہاجر ہوتا ہے۔ جہاں سے چلا ہے بڑی دور کا سفر کیا ہے۔ کئی زمانے دیکھے ہیں۔ پلٹتا ہوا یہ واپس آئے گا اور آخر کار کسی سوراخ میں چھپ کے بیٹھ جائے گا۔ And this is worry ''کل شیء یرجع الی اصلہ'' مقولہ عرب) وہ قافلہ انسان جو Cave سے شروع ہوا اور Escalator تک پہنچا ہوا ہے۔ اس نے واپس غاروں کو جانا ہے۔ شاید ان کی فہم وفراست اور بہت سارے رجائیت پسند انسان ومفکر اور دانش ور اپنی عقل ودانش سے یہ انجام آور دکریں۔

اکیسویں صدی کے دانشور جو آج اس دنیا میں ہو رہا ہے اور جو کچھ ہمارے ادیب نقل کر رہے ہیں اس کے بعد تو

یہ لگتا ہے کہ اگر خدا نے انجام دنیا آدھا دن رکھا تھا تو وہ اب ایک چوتھائی کرنے کی فکر میں ہے۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب وہ ہے جو دوسرے کلچر کے ساتھ بھی ویسا ہی انصاف کرے جیسا وہ چاہتا ہے کہ اس کے اپنے کلچر کے ساتھ ہو۔ میں نے اسی لیے سفرنامہ نہیں لکھا کیونکہ امریکہ کے باشندوں میں احساس گناہ نہیں تھا۔

They were not accountable to any Religious person.

مجھے وہاں ایک انگریز نے کہا کہ اگر ہم پر خوف خدا نہ ہو تو ہم بھی صوفی ہوتے۔ میں نے اسے جواب دیا کہ تم میں صوفی کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کہ تمہاری تو مجبوری ہے۔ تم تو آزاد رہنا چاہتے ہو۔ تم دنیا کا ہر شوق رکھتے ہو، تم چاہتے ہو کہ ہر چیز کھاؤ اور شراب، کباب کے تمام شوق پورے کرو لیکن میری تو مجبوری یہ ہے کہ میں پوری ذہنی رسائی کے ساتھ یا جہاں تک میرے ذہن کی رسائی تھی میں خدا کا قائل ہو چکا ہوں۔ میرے پاس انکار کے Arguments نہیں ہیں۔ میں مجبور ہو چکا ہوں، میری Accountabilty مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں وہ افعال نہیں کرسکتا جس کے لیے خدا کی مخالفت مول لوں۔ گناہ وثواب میرے Practical اعمال نہیں، گناہ وثواب تو ارشادات خداوند میں ہیں اس کا میں جج نہیں ہوں۔ مجھے بڑے گناہ بہت خوبصورت لگتے ہیں اور بڑی نیکیاں مجھے Bore لگتی ہیں۔ میں چونکہ مجبور ہوں۔ میرا اہتمام، اعتبار اعتماد گناہ وثواب پر نہیں، ملائکہ پر نہیں ہے۔ یہ سارے اعتبارات صرف ایک اعتبار کا حصہ ہیں جو مجھے خدا پر ہے۔ لوگ مجبور ہیں۔ میں نے امریکہ میں مسافرت کے دوران یہ دیکھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک لوگ تھے، اگر میرے سر پر خدا نہ ہوتا تو میں بھی ویسی ہی زندگی گزارنا چاہتا۔ آپ کے اور ان کے طرز عمل میں کتنا فرق ہے؟ ہم نے تو مرنا بھی ہے، اٹھنا بھی ہے، جواب بھی دینا ہے اور آخرت میں جانا ہے۔ منکر نکیرین سے ملنا ہے۔ جنت اور دوزخ کے مقامات دیکھنے ہیں۔ پھر لڑھک کر کہیں پل صراط سے گزرنا ہے، پھر حوض کوثر پر پہنچنا ہے۔ اتنی Crucial داستانیں ہمارے ذہنوں میں ہیں جن مقامات پر یہ ساری چیزیں واقع ہیں، ہاں وہ ساٹھ ستر سال کی مسافرت تو کام ہی نہیں آئے گی۔ خداوند کریم نے اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رانجھا صاحب کیا بتائیں گے کہ سفرنامہ کیا ہے۔ فرمایا ''پورے کا پورا دین ہی اس کائنات کا سفرنامہ ہے۔'' رانجھا اس مسافر کی طرح ہے کہ جس نے شائد دینداری اور پرہیزگاری کو تھام کے یہ سفر کیا ہے۔ یہ سچی بات ہے کہ رانجھا صاحب نے ایک اچھے اور نیک مسافر کی طرح یہ سفر کیا ہے۔ اگر موصوف دل ونگاہ پر کنٹرول کرتے ہوئے احتیاط سے سفر نہ کرتے تو یقیناً وہیں کے ہو کر رہ جاتے۔ کیونکہ کلچرل Aspects میں آپ کا کلچر، اس کلچر کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک تقابل کی خاطر پوری تاریخ میں آپ یہ دیکھیں گے کہ اسلام کہاں کہاں آیا اور کہاں کہاں فوجیں اتریں؟ آپ حیران ہوں گے کہ بیشتر جگہوں پر کوئی مسلمان فوج نہیں اتری۔ انڈونیشیا میں کوئی نہیں اتری، سراندیپ میں کوئی نہیں اتری، موریشس میں کوئی نہیں اتری تو بیشمار جگہوں پر اسلام ہی اسلام ہے۔ مجھے ان لوگوں کی حماقت سمجھ نہیں آتی کہ ایک مسافر ان کے ساحل پہ اترتا ہے اور اگلے دن سارے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ لوگ اتنے جاہل ہیں، نہیں شائد ایسا نہ ہو۔

میرے ایک جماعت اسلامی کے دوست تھے (اس وقت میرے جماعت اسلامی کے ہی دوست ہوا کرتے تھے) بڑے پکے دوست تھے کہ وہ ہر وقت مجھ سے کہا کرتے تھے کہ یہ کافر ہے، وہ کافر ہے یہ زیادتی ہے، یہ عمل مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ فلاں بات مذہب کے خلاف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور میں ان کے اشارات سے فقرے مرتب کرلیا کرتا

تھا۔ تو وہ اتفاقاً امریکہ چلے گئے۔ کوئی سال دو سال بعد ان کی واپسی ہوئی۔ مجھے کہنے لگے یار کیا ہم لوگ زیادہ
Prejudice نہیں ہیں؟ میں نے کہا کیسے۔ تو کہنے لگے کہ کتنا واہیات ہے کہ ہم نے فلاں شخص کو کافر Declare کیا ہوا
ہے اور ہر وقت ہر چیز پر فتوے لگاتے رہتے ہیں۔ ہم ضرورت سے زیادہ متعصب ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج کل
نماز پڑھ رہے ہو۔ جواب دیا کہ آج کل امریکہ میں ماحول ایسا نہیں ہے کہ جہاں نماز پڑھی جائے۔ آخر کار باتوں باتوں
میں پتا لگا کہ بے چارے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے کے مصداق، نیویارک اترتے ہی فلپائنی لڑکی کے عشق میں مبتلا
ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے کا پورا ماحول منچلا ہو گیا۔ اب یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس کلچر میں ایسی کیا طاقت ہے
کہ آپ کا کلچر اسے Face نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت اسلام کے کلچر میں کیا طاقت تھی کہ دنیا کا کوئی کلچر اسے Face نہیں
کر سکا۔ جہاں جہاں مسلمان جاتے تھے مسلمان بنانے کی ایک فیکٹری کھل جاتی تھی۔ یعنی جدھر بھی گئے، اسلام چھوڑ آئے۔
جدھر بھی گئے مسلمان چھوڑ آئے اب تو مصیبت پڑی ہوئی ہے آج کے جدید ترین ملکوں کو کہ جہاں جہاں تیل ہے وہاں
وہاں مسلمان ہیں، جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں وہاں تیل ہے۔ مگر اصولاً یہ ان اصحاب کا کرشمہ ہے جو کلی اور انفرادی
اعتبار سے مسافرت پر نکلے ہوئے تھے۔ ان کے پاس پتا نہیں کیا تھا۔ شاید اللہ کی وہ بات سو فیصد درست نکلے کہ جب اللہ
کے بندے زمین پر چلتے ہیں تو آگے آگے ایک نور سعی کرتا ہے اور جو ان لوگوں کو ہر دل عزیز اور مقبول کرتا ہے۔ اور ان
لوگوں کو Power of Integrity of Philosophy دیتا ہے۔ ان لوگوں کا اتنا مضبوط کلچر تھا کہ انہوں نے اپنے
زمانے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو مسخر کیا۔ بے پایاں شان و شوکت اور عزت و عظمت والی Empires ان کے زیر نگیں
رہیں۔ لیکن بعد میں کیا ستم ہوا کہ کچھ درویش وہاں چلے گئے، نہ شکلیں نہ انداز نہ فکر! ان کلچرز کے ٹکراؤ میں یہ فقیہہ جیت گئے
اور وہ تہذیبات شکست کھا گئیں۔ It is one base کہ یہ ذہنی ٹکراؤ ہے اگر آپ کمزور ذہن کے ہیں تو آج بھی دوسری
Civilizations آپ کو Suggestions دے رہی ہیں مگر ذہنی ٹکراؤ میں Dogmatic Fundamentalism
کام نہیں آتا، اندھا دھند تقلید کام نہیں آتی اور اندھا دھند تقلید کے بارے میں ارشاد باری ہے ان شر الدوآب عند الله
الصم البکم الذین لا یعقلون (الانفال: ۸-۲۲) ''کہ بدترین ہیں وہ انسان جو غور و فکر نہیں کرتے، جو عقل استعمال نہیں
کرتے اور اندھے اور بہروں کی طرح میری آیات پر گرتے ہیں'' آج کل ہر سفرنامے میں، اس احساس کی بنیاد ہمیں ملتی
ہے کہ ہر مسافر اس فہم و فراست، اقرار ذات خداوند کا اپنی Priorities پر قائم نہیں ہے جو اللہ، قرآن اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے دی ہیں۔ مجھے ایک بار ایک اچھے پروفیسر نے کہا کہ اس نے چودہ سال مسلسل خدا ڈھونڈا
ہے لیکن اسے خدا کیوں نہیں ملا۔ تو میں نے صرف ایک جملہ کہا:

Allah is not mathematical approaches, or thesis or researches. It is the top priority of the intellectual curiosity.

اللہ کے دین کی جستجو، تخلیق کار ذہن کی اعلیٰ ترین ترجیح ہے جو انسان کے نفس کی تمام تر جیحات پر مکمل غلبہ چاہتا
ہے جو کہ Fundamentalist ہے۔